3

روحانیت میں ترقی حاصل کرنے کا طریق

(فرمودہ 31، جنوری 1941ء بمقام لاہور)

تشہّد، تعوّذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:۔

"میری نیت تو قادیان جا کر جمعہ پڑھانے کی تھی مگر گھر سے چونکہ زیادہ بیمار ہو گئے اور کل سے میری کھانسی میں بھی شدت پیدا ہو گئی اس لئے مَیں نہیں جا سکا لیکن آج میری کھانسی کی جو حالت ہے اس کی وجہ سے یہاں بھی زیادہ دیر تک بلند آواز سے نہیں بول سکتا۔ خصوصاً آج صبح کے وقت تو مجھے اس قسم کا ضعف محسوس ہوتا تھا کہ بعض دفعہ بالکل بیٹھنا بلکہ لیٹنا بھی دوبھر معلوم ہوتا تھا۔

ہماری لاہور کی جماعت اس طرح مختلف علاقوں میں پھیلی ہوئی ہے کہ اسے کسی ایک نظام کے نیچے لانا آسان کام نہیں۔ کسی محلہ میں دس پندرہ آدمی ہیں، کسی میں بیس، کسی میں پچاس، کسی میں دو چار اور کسی میں ایک ہی ہے اور اس وجہ سے باجماعت نمازوں میں باقاعدگی بہت مشکل ہے۔ گو ایک لحاظ سے مشکل نہیں بھی۔ کیونکہ اگر آدمی ارادہ کر لے تو اس کے پورا کرنے میں زیادہ دقّت محسوس نہیں ہوتی۔ مگر اس زمانہ میں لوگ نماز باجماعت کو زیادہ ضروری نہیں سمجھتے۔ رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں یہ حال تھا کہ ایک نابینا حضور کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یَا رَسُوْلَ اللہ! مَیں نابینا ہوں لوگوں نے گلیوں میں پتھر رکھے ہوئے ہیں۔ اُس وقت کچے مکان ہوتے تھے اور جس طرح ہمارے ملک میں بھی لوگ کچے مکانوں کے ساتھ ساتھ پتھر وغیرہ رکھ چھوڑتے ہیں تا کہ پرنالہ وغیرہ سے گلیں نہیں عرب

میں بھی لوگ پتھر وغیرہ رکھ چھوڑتے تھے۔ اس نابینا نے عرض کیا کہ رستوں میں پتھر وغیرہ ہوتے ہیں اندھیرے میں دوسرے لوگوں کو بھی ٹھوکریں لگتی ہیں اور ان کے پاؤں بھی زخمی ہو جاتے ہیں اور مَیں تو نابینا ہوں۔ اگر اجازت ہو تو رات کی نمازیں گھر میں ہی پڑھ لیا کروں۔ آپ نے فرمایا اچھا اجازت ہے۔ مگر جب وہ چلا تو فرمایا اسے بلاؤ اور وہ دوبارہ آیا تو فرمایا تمہارے گھر تک اذان کی آواز پہنچتی ہے یا نہیں؟ اس نے عرض کیا پہنچتی ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ پھر گھر میں پڑھنے کی اجازت نہیں جس طرح بھی ہو مسجد میں آکر باجماعت نماز ادا کیا کرو۔ [1]

غرض آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے تو نابینا کے لئے بھی صحت کی حالت میں مسجد میں باجماعت نماز ادا کرنا ضروری قرار دیا ہے مگر اب لوگ اس بات کی زیادہ پرواہ نہیں کرتے۔ مگر ساتھ یہ شکایت ضرور کرتے ہیں کہ وہ روحانیت نظر نہیں آتی جو پہلے بزرگوں میں تھی اور جس کا ذکر پہلی کتابوں میں ملتا ہے۔ حالانکہ وہ روحانیت کس طرح حاصل ہو سکتی ہے جب تک وہ کام نہ کئے جائیں جو وہ کرتے تھے۔ وہ کثرت سے ذکر الٰہی کرنا، درود شریف پڑھنا، مساجد میں بیٹھ کر اللہ کو یاد کرنا اور نمازوں کو باجماعت ایسی پابندی سے ادا کرنا کہ جس کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ کے فضل نازل ہوتے تھے۔ اب بالکل نہیں۔ مثل مشہور ہے کہ ہندوستان میں افغانستان کے ایک بادشاہ وہاں سے بھاگ کر آئے ہوئے تھے۔ یہ مہاراجہ رنجیت سنگھ صاحب[2] کا زمانہ تھا۔ مہاراجہ صاحب ان کی مدد کرتے تھے تا ان کے ملک میں بھی اثر و نفوذ بڑھ جائے۔ چنانچہ وہ یہاں سے مدد لے کر گئے اور پھر وہاں اپنی حکومت قائم کی۔ یہاں قیام کے دوران ایک دن مہاراجہ صاحب نے ان سے فرمایا کہ آپ کے افغانستان میں لوگوں کی اولادیں بڑی ہوتی ہیں۔ ہمارے ہاں اتنی نہیں ہوتیں اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کا کوئی نسخہ ہمیں بھی بتائیں۔ بادشاہ نے کہا کہ اس کا جواب میں افغانستان جا کر ہی دے سکتا ہوں۔ آپ میرے ساتھ اپنا کوئی آدمی بھیج دیں مَیں اسے بتا دوں گا۔ چنانچہ جب وہ واپس جانے لگے تو مہاراجہ صاحب نے اپنا ایک

آدمی ساتھ بھیجا کہ نسخہ معلوم کر آئے۔وہاں وہ جا کر دو چار روز رہا اور پھر کہا کہ بتایئے کیا نسخہ ہے؟ بادشاہ نے کہا کہ آپ کل صبح آ جائیں مَیں بتاؤں گا۔چنانچہ وہ اگلی صبح چلا گیا۔بادشاہ اپنے کام میں مشغول رہا جب ناشتہ کا وقت آیا تو بادشاہ نے قریباً آدھ سیر بادام، پستہ، کشمش اورمرغ مسلّم کے کباب کھائے اور اس کے بعد کچھ اور کاموں میں مشغول ہوگئے۔دوپہر کے کھانے کا وقت آیا تو پھر دنبے کا پلاؤ اور اس کی چکی اور اسی قسم کے آٹھ دس کھانے اور کھائے۔عصر کے وقت پھر مرغ مسلّم کھایا اور بادام اور پستہ پھانکا۔اسی طرح شام کو بھی کھایا مگر مہاراجہ صاحب کے آدمی سے کوئی بات نہ کی۔عشاء کے وقت اس نے کہا کہ آپ نے فرمایا تھا نسخہ بتائیں گے مگر بتایا کوئی نہیں۔بادشاہ نے کہا کہ سارا دن بتاتا تو رہا ہوں۔مہاراجہ صاحب سے کہہ دیں کہ ان کے ملک میں لوگ غذا ہی ایسی نہیں کھاتے جس سے کثرت سے اولاد پیدا ہو۔اس سوال کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ ایک انسان سارا دن ہل چلاتا ہے، ہاتھ سے اپنے جانوروں کے لئے چارہ لاتا اور اسے کترتا ہے، دودھ دوہتا ہے اور اسی طرح مشقت کے کام سارا دن کرتا اور پھر اس کے بعد سوکھی روٹی لسّی کے ساتھ یا دودھ یا مکھن کے ساتھ کھا لیتا ہے تو اس کے جسم میں جس قسم کی طاقت پیدا ہو گی وہ ایسے شخص میں کہاں ہو سکتی ہے جو دس پندرہ مرغن غذائیں کھا کر سارا دن چارپائی پر بیٹھا رہتا ہے۔قوت زیادہ کھانے سے نہیں بلکہ ہاضمہ سے پیدا ہوتی ہے۔بالکل یہی حال روحانیات میں ہے۔جو لوگ ذکر الٰہی تو کرتے ہیں مگر نفس کی تربیت نہیں کرتے ان کو بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور جو ذکر الٰہی نہیں کرتے اور صرف تربیت نفس کی طرف ہی متوجہ رہتے ہیں وہ بھی محروم رہتے ہیں۔ جس طرح جسمانیات میں اگر کوئی شخص ورزش تو کرے مگر کھائے کچھ نہیں بیمار ہو جاتا ہے اور جو زیادہ کھاتا تو رہے مگر ورزش نہ کرے وہ بھی بیمار ہو جاتا ہے۔ صحت کی درستی اور طاقت کے لئے دونوں چیزوں کی ضرورت ہے۔یہی حال روحانیت کا ہے۔ ایک طرف قلب، خیالات اور ارادوں کو پاک و صاف کرنا ضروری ہے اور

دوسری طرف ذکر الٰہی کرنا، کثرت سے درود شریف پڑھنا اور خدا تعالیٰ کی یاد میں کچھ وقت خاموش بیٹھنا اور اس کی صفات پر غور و فکر کرنا ضروری ہے۔ پھر نمازوں کی باقاعدگی اور نماز میں دعائیں کرنا بھی ضروری ہے۔ نفسانی تربیت ایسے ہی ہے جیسے جسمانی غذا، نماز کی ظاہری حرکات، روزے یا دوسرے ضروری امور مثلاً چندے وغیرہ دینا، تبلیغ کرنا بھی روحانیت کی طاقت کو مضبوط کرتے ہیں۔ دعا دل اور ارادوں کی تطہیر اور ذکر الٰہی نئی طاقتیں پیدا کرتے ہیں اور پہلی طاقتوں کو نشو و نما دیتے ہیں اور یہ سب چیزیں مل کر ہی روحانیت کو طاقت دے سکتی ہیں۔ دونوں میں انسان ترقی کرے تو اس کی روحانیت میں ترقی ہو سکتی ہے اس کے بغیر نہیں مگر مَیں دیکھتا ہوں کہ اس زمانہ میں مغربی تعلیم کے زیر اثر ذکر الٰہی اور دل کی تطہیر کی طرف توجہ بہت کم ہے او رلوگ بِالعموم اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کو ایک سودا سمجھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جب ہم نے فرض ادا کر دیا تو اور کوئی ذمہ داری ہم پر باقی نہیں رہی۔ حالانکہ فرائض کی ادائیگی صرف انسان کو سزا سے بچا سکتی ہے۔ انعام کا مستحق اسے صرف نوافل ہی بنا سکتے ہیں۔ حکومتیں کئی قسم کے ٹیکس لگاتی ہیں۔ مثلاً بعض میونسپل ٹیکس ہیں، انکم ٹیکس ہے یا بعض اور ٹیکس ہوتے ہیں جنہیں انسان ادا کرتا ہے یا منی آرڈر وغیرہ پر فیس ہوتی ہے۔ کیا کوئی جاہل سے جاہل بھی کبھی افسروں سے کہتا ہے کہ مَیں نے منی آرڈروں کی فیس کے طور پر ہزاروں روپے حکومت کے خزانے میں داخل کئے ہیں مجھے خطاب دیا جائے؟ اگر کوئی یہ کہے بھی تو وہ کہہ دیں گے کہ تم نے فیس دی اور ہم نے تمہار اروپیہ پہنچا دیا بات ختم ہو گئی۔ خطاب کس بات کا؟ پس فرائض کی ادائیگی کسی انعام کا مستحق نہیں بنا سکتی۔ انعام کے طالب وہی ہو سکتے ہیں جو کوئی زائد کام کریں۔ محض ٹیکس کا ادا کرنا کسی خطاب کا مستحق نہیں بنا سکتا۔ ہاں اگر کسی ملک یا شہر میں فساد ہو اور کوئی شخص اسے فرو کرنے میں مدد دے تو وہ کہہ سکتا ہے کہ فرض کے طور پر میرا کام صرف یہ تھا کہ مَیں کسی فساد میں حصہ نہ لوں۔ مگر مَیں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ پولیس کے ساتھ مل کر

مَیں نے اسے دور کیا اور اس طرح اپنے فرض سے زائد کام کیا۔ فرض صرف یہی تھا کہ مَیں فساد میں خود حصہ نہ لوں لیکن اس سے زائد کام کرنے کی وجہ سے مَیں انعام کا مستحق ہوں تو اس کا مطالبہ معقول ہو گا۔

غرض انعام کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ فرض سے بڑھ کر کام کیا جائے۔ فرائض کو ادا کر دینا انسان کو سزا سے تو بچا سکتا ہے مگر قُربِ الٰہی کا موجب نہیں ہو سکتا۔ قرب نوافل سے ہی ملتا ہے اور نمازباجماعت بھی فرائض میں داخل ہے۔ اس کے بعد وہ چیزیں ہیں جو نوافل کا درجہ رکھتی ہیں مثلاً ذکرِ الٰہی کرنا، استغفار کرنا، صفاتِ الٰہی پر غور کرنا۔ دن میں، اپنے کام کے دوران میں جب بھی وقفہ ملے تسبیح، تحمید اور تکبیر کرتے رہنا بلند آواز سے ہی ضروری نہیں بلکہ آہستہ آہستہ بھی یہ ذکر کیا جا سکتا ہے۔ یہ چیزیں روح میں طاقت پیدا کرتی ہیں اور انسان کو اللہ تعالیٰ کے قریب کرتی ہیں۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ مومن نوافل سے ہی خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کرتا ہے اور جوں جوں وہ نوافل میں ترقی کرتا ہے خدا تعالیٰ کے زیادہ قریب ہوتا جاتا ہے۔ اگر وہ ایک قدم خدا تعالیٰ کی طرف اٹھاتا ہے تو خداتعالیٰ دو قدم اس کی طرف آتا ہے۔ اگر وہ چل کر خدا تعالیٰ کی طرف جاتا ہے تو خدا تعالیٰ اس سے تیز چل کر اس کی طرف آتا ہے۔ اگر وہ تیز چل کر جاتاہے تو خدا تعالیٰ دوڑ کر اس کی طرف آتا ہے یہاں تک کہ نوافل کے ذریعہ ایک دن ایسا آ جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ اس کے ہاتھ بن جاتا ہے جن سے وہ کام کرتا ہے ، خدا تعالیٰ اس کے پاؤں بن جاتا ہے جن سے وہ چلتا ہے، خدا تعالیٰ اس کی زبان بن جاتا ہے جس سے وہ بولتا ہے اور خدا تعالیٰ اس کی آنکھیں بن جاتا ہے جن سے وہ دیکھتا ہے اور خداتعالیٰ اس کے کان بن جاتا ہے جن سے وہ سنتا ہے۔3؎ مگر یہ مقام سوائے اس حالت کے حاصل نہیں ہو سکتا جو عشق کی ہوتی ہے۔

عاشق کے معنی عام طور پر پاگل کے ہی سمجھے جاتے ہیں جن کا قصوں میں ذکر ہے مثلاً مجنوں، فرہاد وغیرہ۔ مگر عشق دراصل شدید محبت کا نام ہے۔ جیسے ماؤں کو

اپنے بچوں سے ہوتی ہے یا باپ کو بچوں سے ہوتی ہے، خاوند کو بیوی سے اور بیوی کو خاوند سے ہوتی ہے۔ان کے قلوب کی جو کیفیت ہوتی ہے کیا وہ فرائض والی حالت ہوتی ہے؟ فرائض والی کیفیت تو نوکر اور آقا کی ہوتی ہے جس میں بسااوقات یہ شرائط ہوتی ہیں کہ مَیں یہ کام کروں گا اور یہ نہیں کروں گا مگر گھروں میں کبھی یہ باتیں نہیں ہوتیں۔کیا بچوں کے معاملہ میں یا خاوند اور بیوی کے معاملہ میں کوئی شرائط ہوتی ہیں؟ دس پندرہ روپیہ تنخواہ لینے والے نوکر سے بھی اگر کہو کہ پاخانہ اٹھائے تو کبھی خوشی اور بشاشت سے نہیں اٹھائے گا۔ مگر دس ہزار روپیہ ماہوار کمانے والے انسان کی بیوی جو اس کے درجہ میں برابر کی شریک ہے اگر کوئی ایسا موقع آ جائے تو بغیر کسی ہچکچاہٹ کے خاوند کا پاخانہ اٹھا دے گی اور اسی طرح خاوند بیوی کا اٹھا دے گا۔خواہ وہ گورنر، وائسرائے بلکہ بادشاہ ہی کیوں نہ ہو۔اگر کوئی ایسا موقع آئے کہ نوکر پاس نہ ہو اور بیوی کو قے ہو جائے تو کیا وہ انتظار کرے گا کہ نوکر کو بلائے اور وہ اسے صاف کرے۔وہ اس وقت یہ خیال نہیں کرے گا کہ یہ کام چوہڑوں کا ہے بلکہ وہ خود اسے صاف کرے گا۔

تو محبت کے موقع پر فرائض کو نہیں دیکھا جاتا۔مولویوں نے شریعت کی حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے فقہ کی کتابوں میں عجیب مسائل لکھ دیئے ہیں مثلاً خاوند پر فرض یہی ہے کہ بیوی کو دو جوڑے کپڑے دے دے اور کھانا مہیا کر دے خواہ کوئی غریب ہو یا بادشاہ بس اس پر دوجوڑے ہی فرض ہیں حالانکہ بعض لوگ چاہتے ہیں کہ ان کی بیوی کئی کئی جوڑے دن میں بدلے اور بعض دو بھی نہیں دے سکتے تو ایسے فتووں پر انسان کس طرح عمل کر سکتا ہے؟ بعض گھروں میں کام زیادہ ہوتا ہے عورتیں کپڑے خود نہیں دھو سکتیں اور بعض مرد نفاست پسند ہوتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ بیوی دوسرے تیسرے روز کپڑے بدلے۔ اب یہ دو جوڑوں سے تو نہیں ہو سکتا اور اس لئے وہ بغیر اس خیال کے کہ فقہ کی کتابوں میں کیا لکھا ہے کافی کپڑے بنا دیتے ہیں۔

پھر بعض لوگ دو جوڑے بھی نہیں بنا کر دے سکتے اس لئے یہ کوئی پابندی نہیں کی جا سکتی۔ بعض لوگ بیوی کو پچاس سو بلکہ ہزاروں روپیہ ماہوار جیب خرچ دے دیتے ہیں مگر کئی لوگ ہیں جو روٹی بھی مہیا نہیں کر سکتے۔ اب اس معاملہ میں کون یہ دیکھتا ہے کہ فقہاء کیا کہتے ہیں۔ میاں بیوی کے تعلقات میں ان باتوں کو نہیں دیکھا جا سکتا بلکہ اس تعلق کی بنیاد محبت پر ہوتی ہے۔ ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ جتنا بھی ہو سکے ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہوں۔

غرض جوڑوں کی قید صرف فرائض کی ادائیگی تک تو ہو سکتی ہے مگر محبت کے تعلقات میں اسے قائم نہیں رکھا جا سکتا بلکہ میاں یہ دیکھتا ہے کہ اپنی بیوی کو زیادہ سے زیادہ آرام پہنچائے اور بیوی یہ کہ زیادہ سے زیادہ خدمت خاوند کی کر سکے اور وہ ایسی خدمت کرتی ہے کہ بعض اوقات چار پانچ روپیہ کا نوکر بھی نہیں کر سکتا۔

مَیں دوسروں کا نہیں کہتا خود اپنے گھر کا تجربہ بیان کرتا ہوں۔ کئی بار شدید بیماری کی حالت میں ایسے مواقع بھی آئے ہیں کہ چارپائی کے قریب ہی کموڈ پر پاخانہ یا پیشاب کرنا پڑا اور ملازمہ وغیرہ کو جب اٹھانے کو کہا گیا تو اس نے کہا کہ ابھی چُوہڑی آتی ہے وہ اٹھا لے جائے گی۔ مگر بیوی نے فوراً اٹھا کر باہر رکھ دیا اسے یہ احساس تک بھی نہیں ہوا کہ یہ چُوہڑی کا کام ہے بلکہ اس وقت اسے یہ پتہ بھی نہیں لگ سکا کہ یہ ایسا کام ہے جو میرے کرنے والا نہیں۔ یہی حال خاوند کا ہوتا ہے۔ تو محبت کے تعلقات ایسی ہی بنیادوں پر قائم ہوتے ہیں۔ فرائض کی ادائیگی پر نہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ و السلام فرمایا کرتے تھے کہ کسی صوفی سے کسی نے پوچھا کہ مجھے کوئی ایسا کلمہ بتا دو جس کا مَیں ذکر کیا کروں۔ انہوں نے کوئی کلمہ بتا دیا۔ اس نے پھر پوچھا کہ کتنی دفعہ روزانہ یہ ذکر کیا کروں؟ وہ صوفی خدا رسیدہ تھے یہ سوال سن کر حیرت میں پڑ گئے۔ تھوڑی دیر بالکل خاموش رہے اور پھر فرمایا کہ ''یار دا ناں لینا تے گِن گِن کے؟'' یعنی کیا محبوب کے ذکر پر بھی گنتی اور شمار کی قید لگائی جا سکتی ہے؟ اگر محبت ہو تو جو بھی فرصت کا وقت ہو اس میں اس کی

یاد آ گئی۔ گننے کا کیا مطلب؟

تو سوائے ان عبادتوں کے جو فرض ہوتی ہیں اور جن کا گننا بھی ضروری ہوتا ہے نوافل میں سے بھی بعض نوافل سنت کا رنگ رکھتے ہیں۔ ان کے سوا جب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ و السلام سے کوئی پوچھتا کہ فلاں ذکر کتنی بار کرنا چاہئے تو آپ فرماتے کہ جب تک طبیعت میں بشاشت پیدا ہو۔ تعداد آپ نے کبھی نہیں بتائی۔ تو یہ نوافل ہیں جو انسان کے اندر حقیقی محبت پیدا کرتے ہیں۔ عبادت کو صرف فرائض تک محدود رکھنے کے معنے تو صرف یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ آقا ہے اور مَیں اس کا نوکر ہوں اس سے زیادہ نہیں۔ اور نوکر و آقا کے تعلقات خواہ کیسے بھی کیوں نہ ہوں محبوب اور محب اور عاشق و معشوق کے پاکیزہ تعلقات کا مقابلہ ہرگز نہیں کر سکتے۔

مُحِبّ اور محبوب کا تعلق امن و راحت کا تعلق ہوتا ہے اور یہ تعلق اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب انسان کے اندر محبت کا رنگ پیدا ہو اور وہ حدود و قیود کو نظر انداز کر دے اور ہر وقت دل میں یہ احساس رہے کہ مَیں نے اس تعلق میں ترقی کرنی ہے۔ یہ نہیں کہ صبح کی نماز پڑھنے کے بعد صرف یہ احساس ہو کہ اب مَیں نے صرف ظہر کی نماز پڑھنی ہے اور ظہر کے بعد یہ کہ عصر کی پڑھنی ہے بلکہ ہر وقت خدا تعالیٰ کی طرف دھیان رہے۔ صبح کی نماز کے بعد جب ایک دکاندار دکان کا دروازہ کھولے تو اس وقت بھی خدا تعالیٰ کی یاد دل میں ہو اور دل و زبان خدا تعالیٰ کی تسبیح و تحمید کر رہے ہوں اور جب کسی کو سودا دے رہا ہو تو اس وقت بھی دل اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو۔ اور جب گاہک کو سودا دے لے تو دل میں اطمینان ہو کہ مَیں نے اس کا حق نہیں مارا۔ مگر پھر بھی اَسْتَغْفِرُ اللّٰہ پڑھتا رہے کہ شاید مجھ سے کوئی کمی رہ گئی ہو تو اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دے۔ وزن پورا دیا ہو، سودا بھی ناقص نہ ہو۔ سب کچھ ٹھیک کرنے کے بعد بھی یہ خیال ہو کہ کوئی ایسی بات مجھ سے نہ ہو گئی ہو کہ جو میرے محبوب کی ناراضگی کا موجب ہو اور اس لئے

استغفار کرتا رہے۔ یہی حال زمیندار کا ہو وہ پورے زور کے ساتھ ہل چلا رہا ہو مگر دل میں ذکرِ الٰہی کرتا رہے۔ یہ دونوں کام ایک ہی وقت ہو سکتے ہیں۔ صرف یہ کافی نہیں کہ صبح کی نماز پڑھ لی ہے اور اب ظہر کی پڑھنی ہے اور ظہر کی پڑھ لی ہے تو اب عصر کی پڑھنی ہے بلکہ جب بھی موقع ملے خدا تعالیٰ کو یاد کرتا رہے۔ یہی وہ چیز ہے جو روح کو طاقت دیتی اور دل کو صاف کرتی ہے اور اسی کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ کا قرب حاصل ہو سکتا ہے۔ پس اس زمانہ میں شہروں اور قصبوں میں جو دقتیں ہیں ان کے لحاظ سے ان جگہوں کے رہنے والوں کو ان امور کی طرف بہت توجہ کی ضرورت ہے۔ خصوصاً لاہور میں جہاں میلوں کا فاصلہ ہے۔ بے شک اِس زمانہ میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنے کے لئے سواریاں بھی ہیں مگر وہ سب کو میسر نہیں اور لاہور میں تو وہ ابھی رائج بھی نہیں۔ یورپ میں شہروں کے اندر بھی ریلیں چلتی ہیں، بسیں ہیں اور بھی کئی قسم کی سواریاں ہیں مگر یہاں گلیوں کی تنگی کی وجہ سے ایسا انتظام بھی مشکل ہے۔ اس لئے لوگ باجماعت نمازوں میں سست ہو جاتے ہیں۔ لاہور میں بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو مَیں نے سنا ہے جمعہ میں بھی سستی کرتے ہیں مگر یہ لوگ بالکل مُردہ دل ہوتے ہیں اور اس موقع پر مَیں ان کا ذکر نہیں کر رہا ان کے لئے اَور قسم کی نصیحت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اِس وقت تو میرے مخاطب وہ لوگ ہیں جو باقاعدہ نمازیں ادا کرتے ہیں اور باجماعت نماز کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ مَیں ان سے کہتا ہوں کہ ان کی یہ حالت بھی قابل تسلی نہیں۔ ان کو اور آگے بڑھنا چاہئے اور ذکر اذکار کی عادت ڈالنی چاہئے۔ مَیں نے دیکھا ہے کہ تعلیم یافتہ لوگ ذکر اذکار کو غیر ضروری اور حقیر کام سمجھتے ہیں۔ بہت ہی کم ہیں جن کو مَیں نے اس طرف متوجہ دیکھا ہے۔ بیشک ایسے لوگ ہیں جو مساجد میں بیٹھ کر تسبیح و تحمید کرتے ہیں مگر ان کی تعداد کم ہے۔ تسبیح و تحمید کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہاتھ میں ضرور تسبیح پکڑ لی جائے بلکہ زبان سے اور دل و دماغ سے خدا تعالیٰ کی یاد کرنی چاہئے۔ مگر بہت کم لوگ ایسا کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ دلوں میں صفائی پیدا

نہیں ہوتی اور جلدی ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ خدا تعالیٰ سے ان کا تعلق کمزور ہوتا ہے اور ان کی مثال ایسی ہی ہوتی ہے جیسے کوئی شخص سر پر برتن رکھ کر جا رہا ہو۔ ایسے شخص کو اگر ذرا سی ٹھوکر لگے تو برتن بھی نیچے گر جائیں گے ایسے لوگوں کا تعلق خدا تعالیٰ سے ایسا ہی ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ ذرا سی ٹھوکر کے ساتھ خدا تعالیٰ سے الگ ہو جاتے ہیں لیکن محبت ایک ایسی چیز ہے جو بندے اور خدا تعالیٰ کو باندھ دیتی ہے اور جو چیز دوسری سے باندھ دی جائے وہ گرا نہیں کرتی۔ اسے جب پھینکا بھی جائے تو وہ بندھی رہتی ہے۔ تو نوافل خدا اور بندے کو اسی طرح باندھ دیتے ہیں جس طرح ایک چیز دوسری سے رسی یا زنجیر کے ساتھ باندھ دی جاتی ہے یا جس طرح ویلڈنگ کرتے ہیں۔ نوافل سے خدا تعالیٰ اور بندے کے درمیان ویلڈنگ ہو جاتا ہے اور ایسے انسان کو جب ٹھوکر لگے اور وہ گرے تو خدا تعالیٰ بھی ساتھ گرتا ہے تا تفرقہ نہ ہو اور اگر اسے کوئی اوپر پھینکتا ہے تو خدا تعالیٰ بھی ساتھ ہی اوپر جاتا ہے مگر جب تک یہ ویلڈنگ نہ ہو ذرا سی ٹھوکر سے وہ ادھر جا پڑتا ہے اور یہ ادھر۔ اس زمانہ میں ابتلاؤں کی جو کثرت ہے وہ اسی وجہ سے ہے کہ لوگوں نے نوافل اور ذکر اذکار کو بھلا دیا۔ پس مَیں احباب کو خصوصیت سے نصیحت کرتا ہوں کہ نوافل اور ذکر الٰہی جو فرائض اور نماز باجماعت کے بعد ضروری چیزیں ہیں ان کی عادت ڈالیں تا اللہ تعالیٰ اور ان کے درمیان ایسا مضبوط رشتہ قائم ہو جائے جو ذرا ذرا سی ٹھوکروں سے نہ ٹوٹ سکے۔ رسول کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم سے پہلی قوموں پر ایسے عذاب آئے ہیں کہ ان میں سے بعض آروں سے چِیرے گئے مگر وہ مرتد نہیں ہوئے۔4

عیسائیوں کی تاریخ میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ روم کے بادشاہوں نے ان میں سے بعض کو آروں سے چِروا دیا مگر انہوں نے اپنے ایمان کو نہ چھوڑا۔ مگر اب دیکھ لو کتنی جلدی ٹھوکر لگ جاتی ہے۔ یہ فلسفہ اور دہریت کا زمانہ ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت پیدا کرنے والے ذرائع کو لوگوں نے نظر انداز کر دیا ہے۔

اس لئے قلوب میں صفائی پیدا نہیں ہوتی اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس قسم کا جوڑ اور تعلق پیدا نہیں ہوتا جو ایسے بد اثرات سے انسان کو بالا کر دے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جب تک قلب، دماغ اور خیالات میں صفائی نہ ہو ذکر اذکار بھی مفید نہیں ہوتا۔ یہ ایسی ہی بات ہوتی ہے جیسے کوئی انسان عمدہ عمدہ مرغّن کھانے تو کھائے مگر سارا دن چارپائی پر ہی بیٹھا رہے۔ ذکرِ الٰہی اس وقت تک قرب الٰہی کا موجب نہیں ہو سکتا جب تک اس کے ساتھ دل و دماغ میں صفائی نہ ہو۔ محض زبان سے بعض الفاظ کہہ دینا کافی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی نظر دل کی صفائی پر ہوتی ہے اس کے بغیر بسا اوقات ذکرالٰہی عذاب کا موجب ہو جاتا ہے جیسے پیشاب کی بوتل میں اگر کوئی عمدہ شربت ڈال لے تو وہ اسے کوئی بشاشت نہیں پہنچا سکتا یا کوئی عمدہ کھانا پاخانہ کے برتن میں ڈال لے تو وہ اسے کوئی بشاشت نہیں پہنچا سکتا یا کوئی عمدہ کھانا پاخانہ کے برتن میں ڈال لے تو وہ کوئی طاقت نہیں پیدا کرے گا بلکہ صحت کو اور خراب کر دے گا۔ عمدہ غذا اسی وقت مفید ہو سکتی ہے جبکہ وہ برتن بھی صاف ہو جس میں وہ ڈالی جائے۔ بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ فلاں شخص بڑے وظائف کیا کرتا تھا مگر مرتد ہو گیا اور یہ نہیں سوچتے کہ عمدہ سے عمدہ شربت بھی پیشاب کے برتن میں پڑ کر خراب ہو جاتا ہے جس کا دل اور دماغ صاف نہیں اسے ذکر اذکار کوئی فائدہ نہیں دے سکتے۔ جس طرح کہ اچھی غذا خراب برتن میں پڑ کر خراب ہو جاتی ہے یا جیسے کسی اچھے برتن میں خراب غذا ڈال دی جائے تو وہ اچھی نہیں بن جاتی۔ یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں یعنی اپنے دل و دماغ اور خیالات کی صفائی اور پھر ذکر الٰہی کی عادت۔ شاہ ولی اللہ صاحب بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں ان کی ایک پوتی بہت ذکر کیا کرتی تھیں۔ ایک دفعہ ان کے ایک بھائی شاید ان کا نام شاہ عبد الغنی تھا ان سے ملنے آئے تو دیکھا کہ وہ مصلّٰی پر بیٹھی ہیں۔ انہوں نے کہا بہن تم مصلّٰی پر بہت بیٹھی رہتی ہو۔ انہوں نے کہا کہ مجھے ذکر الٰہی میں بڑی لذت آتی ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ مجھے تو یوں نظر آتا ہے کہ تم اس میں غلو کرنے لگی ہو ایسا نہ ہو کہ

فرائض میں سُستی ہو جائے۔ یہ نصیحت کر کے وہ چلے آئے۔ اگلے جمعہ کے بعد پھر ملنے گئے۔ جمعہ کے جمعہ جاتے تھے تو بہن نے کہا کہ اب تو مجھے فرائض سے زیادہ نفلوں میں لذت آتی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہی اصل چیز ہے۔ بھائی نے کہا ہشیار رہو شیطان خدا تعالیٰ سے دور لے جا رہا ہے۔ اگلے جمعہ کو وہ پھر آئے تو بہن نے کہا بھائی بات تو آپ نے ٹھیک کہی تھی اب تو بعض دفعہ مجھے طبیعت پر جبر کر کے فرائض ادا کرنے پڑتے ہیں کوئی علاج بتاؤ۔ بھائی نے کہا لَا حَوْلَ پڑھا کرو۔ اگلے جمعہ وہ پھر آئے تو بہن نے کہا بھائی! خدا آپ کا بھلا کرے مَیں نے کشف میں دیکھا ہے کہ شیطان بندر کی صورت میں بیٹھا غصہ سے دانت پیس رہا ہے اور آپ کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے کہ اس نے تمہیں بچا لیا ورنہ مَیں تو تمہیں جہنم میں لے جاتا۔ تو جب تک دماغ اور قلب کی صفائی نہ ہو اور اس کے ساتھ فرائض کی پابندی، ذکر الٰہی بھی عذاب بن جایا کرتا ہے۔ پس یہ دونوں چیزیں بہت ضروری ہیں۔ ایک ہی طرف لگ جانا بے وقوفی کی بات ہے اور اس سے قرب الٰہی حاصل نہیں ہو سکتا۔ بیک وقت دونوں چیزیں ضروری ہیں اور جب یہ دونوں مل جائیں تو خدا تعالیٰ سے ایسی پیوستگی ہو جاتی ہے اور ایسا لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز پھر ایسے انسان کو خدا تعالیٰ سے جدا نہیں کر سکتی۔ اس کامل محبت کی ایک مثال اسی لاہور میں ظاہر ہو چکی ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے جب دعویٰ کیا تو مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی نے بہت مخالفت کی اور سارے ملک میں پھر کر آپ کے خلاف کفر کے فتوے حاصل کئے بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ مَیں نے ہی اس شخص کو اوپر اٹھایا تھا اور اب مَیں ہی اسے گراؤں گا۔ وہ یہاں لاہور میں آ کر بیٹھ گئے اور خوب زور سے مخالفت شروع کر دی۔

لدھیانہ کے ایک اَن پڑھ سے دوست میاں نظام الدین صاحب تھے بہت ہنس مکھ آدمی تھے حج کا ان کو بے انتہا شوق تھا اور باوجود اس کے کہ ریلیں نہ تھیں اور جہاز بھی دُخانی نہ تھے پھر بھی انہوں نے 8، 10 حج کئے تھے۔ اس زمانہ میں

بہت سا سفر پیدل کرنا پڑتا تھا اور ایک ایک حج میں دو دو سال لگ جاتے تھے۔ان کی طبیعت میں مذاق بہت تھا اور بچوں میں بہت خوش رہتے تھے۔ہمیں بھی وہ اپنے لطائف سنایا کرتے تھے اور ہم ہنس ہنس کر لوٹ لوٹ جاتے تھے بہت سادہ آدمی تھے اور چائے کے بہت عادی تھے۔چونکہ لدھیانہ میں افغان شہزادے رہتے ہیں اس لئے وہاں چائے کا عام رواج ہے۔وہ کہا کرتے تھے کہ میاں! معلوم ہے حج کو جاتے ہوئے ہم چائے کس طرح پیتے ہیں؟ وہاں رستہ میں سماوار وغیرہ کہاں ہوتے ہیں مَیں تو یوں کرتا تھا کہ جہاں چائے کا وقت آیا اور چائے نہ ملی تو چائے کی پتی لی اور پھانک لی پھر جب کہیں گرم پانی ملا اوپر سے وہ پی لیا بس پیٹ میں جا کر آپ ہی چائے بن گئی۔ان کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے بہت محبت تھی اور وہ مولوی محمد حسین صاحب کے بھی بڑے مداح تھے ان کے اوپر بھی اہلحدیث کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ انہوں نے جب سنا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا ہے تو کہا کہ نہیں مرزا صاحب کفر کی بات نہیں کر سکتے ان کو کوئی غلطی لگی ہو گی وہ قرآن کے عاشق ہیں۔وہ یہ شور سن کر قادیان آئے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے؟ لوگ کہتے ہیں آپ قرآن کریم کے خلاف عقائد رکھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا میاں نظام دین! آپ نے کبھی دیکھا ہے کہ مَیں نے قرآن کریم کے خلاف کوئی بات کہی ہو ؟ انہوں نے کہا اللہ آپ کا بھلا کرے مَیں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ لوگ غلط کہتے ہیں یہ بھی تو جھوٹ ہے نا کہ آپ کہتے ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو گئے۔حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا یہ تو سچ ہے مگر قرآن کریم میں یہی لکھا ہے۔میاں نظام الدین صاحب نے کہا کہ قرآن کی بیسیوں آیات ان کے زندہ ہونے کی شاہد ہیں۔حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر ایک بھی ہو تو مَیں مان لوں گا۔ وہ کہنے لگے کہ بس مَیں نے پہلے ہی کہا تھا کہ کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو گی اب معاملہ صاف ہو گیا۔ مَیں ایک سو آیات مسیح علیہ السلام کی زندگی کے ثبوت میں لکھوا لاتا ہوں۔حضرت مسیح موعود علیہ السلام

نے فرمایا کہ نہیں سَو کی تو کوئی ضرورت نہیں ہم تو ایک بھی ہو تو مان لیں گے۔ انہوں نے کہا کہ اچھا پچاس لے آؤں؟ آپ نے فرمایا مَیں تو ایک کو بھی ماننے کو تیار ہوں۔ آخر میاں نظام الدین صاحب نے کہا اچھا مَیں دس آیات لکھوا لاتا ہوں کیا آپ ان کو دیکھ کر اپنے خیال سے رجوع کر لیں گے؟ آپ نے فرمایا کہ ہم تو ایک آیت بھی دیکھ کر رجوع کر لیں گے۔اس پر وہ اٹھے اور کہا پھر یہ وعدہ کریں کہ لاہور چل کر شاہی مسجد میں اپنی غلطی کا اعتراف کریں گے تاکہ سب ملک کو معلوم ہو جائے۔ آپ نے فرمایا بہت اچھا۔ وہ خوش خوش لاہور کی طرف روانہ ہو گئے جہاں اُس وقت مولوی محمد حسین صاحب اُن دنوں مخالفت کا شور بلند کر رہے تھے اور چینیاں والی مسجد میں جہاں اہلحدیثوں کا جمعہ ہوتا ہے اس میں مقیم تھے۔ اتفاق سے حضرت خلیفہ اول بھی ان دنوں چھٹی لے کر یہاں آئے ہوئے تھے اور مولوی محمد حسین صاحب نے ان کے خلاف بھی اشتہار بازی شروع کر رکھی تھی کہ کافر کا چیلا یہاں آ گیا ہے اور اعتراض کر رہے تھے۔ حضرت خلیفہ اول بھی جواب دیتے تھے۔ مولوی محمد حسین صاحب کہتے تھے کہ قرآن کریم کی جو تفسیر احادیث میں ہو وہی قابل قبول ہے اور آپ فرماتے تھے کہ بعض احادیث غلط بھی ہو سکتی ہیں۔ آخر آپ نے مان لیا کہ اچھا قرآن کریم اور بخاری میں جو بات ہو وہ مَیں مان لوں گا اور مولوی محمد حسین صاحب اپنے معتقدین میں بیٹھے بڑے زور سے یہ کہہ رہے تھے کہ دیکھا مَیں نے کس طرح نور الدین کو قابو کیا اور آخر حدیث کی طرف لے آیا ہوں۔ انہیں اپنی تعریف آپ کرنے کی بہت عادت تھی اور اس بات کو بڑے فخر سے بیان کر رہے تھے کہ اُدھر سے میاں نظام الدین پہنچ گئے اور کہا کہ بس چھوڑیئے اب فیصلہ ہو گیا۔ مَیں قادیان گیا تھا مرزا صاحب میرے دوست ہیں مجھے یقین تھا کہ وہ قرآن کریم کو نہیں چھوڑ سکتے۔ اب مَیں آیا ہوں اور اُن سے یہ فیصلہ کر آیا ہوں کہ دس آیات وفات مسیح کی تائید میں مَیں ان کو دکھا دوں گا اور وہ شاہی مسجد میں آ کر اپنے خیالات سے توبہ کر لیں گے۔ بس آپ مجھے

دس آیات لکھ دیں۔ یہ بات سن کر مولوی محمد حسین صاحب کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور بڑے غصہ سے کہا کہ تم جاہل آدمی ہو تمہیں کس نے کہا ہے کہ علمی باتوں میں دخل دو۔ مَیں تین ماہ تک کوشش کر کے نور الدین کو حدیث کی طرف لایا تھا یہ پھر قرآن کی طرف لے جا رہا ہے۔ یہ بات مولوی محمد حسین صاحب نے غصہ میں کہہ دی اور یہ خیال نہ کیا کہ اس سے ان کی کمزوری کا اظہار ہوتا ہے۔ میاں نظام دین تھے تو بیشک اَن پڑھ مگر جب یہ بات سنی تو ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ تھوڑی دیر خاموش رہے اور پھر یہ کہہ کر مولوی صاحب! ''اچھا جدھر قرآن اُدھر ہم۔'' اٹھ کر چل پڑے اور قادیان میں آ کر بیعت کر لی۔ ان کا خدا تعالیٰ کے ساتھ تعلق محبت کا تھا۔ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ مَیں ہر چیز کو چھوڑ سکتا ہوں مگر خدا تعالیٰ کے کلام کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اس لئے جب دیکھا کہ مولوی محمد حسین قرآن کریم کو چھوڑ رہے ہیں تو کسی اور دلیل کی ضرورت ہی نہ رہی۔ اور جب مومن کی یہ حالت ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اسے محبت کا ایسا تعلق ہو جائے تو پھر اسے کوئی ابتلاء پیش نہیں آ سکتا وہ یہی کہتا ہے کہ اچھا جدھر قران اُدھر ہی ہم۔ دوسرا کلمہ اس کی زبان سے نہیں نکلتا اور جو شخص خدا تعالیٰ کا قرب چاہتا ہے اسے یہی مقام حاصل کرنا چاہئے اور خدا تعالیٰ کے ساتھ مضبوطی سے بندھا ہوُا ہونا چاہئے۔ یہ نہیں کہ تعلق کمزور ہو اور ذرا سی ٹھوکر لگنے پر یہ ادھر اور وہ ادھر جا پڑے۔ یہی اصل اطمینان کا مقام ہوتا ہے۔ اور اسی سے خدا تعالیٰ کے وہ فضل نازل ہوتے ہیں جن کے بغیر نجات حاصل نہیں ہو سکتی۔ جب خدا تعالیٰ کے ساتھ ایسا مضبوط تعلق قائم ہو جائے تو ایسے انسان کو گو دنیا بھی چھوڑ دے، لوگ کتنا اسے بدنام کریں مگر خدا تعالیٰ اسے نہیں چھوڑتا۔ جس دن حضرت مسیح ناصری علیہ السلام کو صلیب دیا گیا اس دن کون کہہ سکتا تھا کہ ان کے بعد بھی کوئی ان کا نام لے گا حتّٰی کہ حواری بھی ان کو چھوڑ گئے۔ مگر ان کا خدا تعالیٰ سے مضبوط تعلق تھا۔ پس خدا تعالیٰ نے ان کو نہ چھوڑا اور آخر ان کا نام عزت سے دنیا میں قائم ہو گیا۔

دشمنوں نے جب حضرت امام حسین علیہ السلام کو کربلا کے میدان میں شہید کیا تو کون کہہ سکتا تھا کہ ان کا نام دنیا میں عزت سے یاد کیا جائے گا۔ اس وقت دشمن کتنے فخر سے کہتے ہوں گے کہ ہم نے موذی کی نسل کا ہی صفایا کر دیا اور دیکھ لو کیسا برا انجام ان لوگوں کا ہوا۔ مگر زمانہ نے آخر کیا ثابت کیا؟ یہی کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ تعلق رکھنے کی وجہ سے خاندان کی تباہی کے باوجود بھی ان کا نام ہمیشہ عزت کے ساتھ زندہ ہے۔ اور اولاد بھی اتنی پھیلی ہے کہ دنیا کے ہر گوشہ میں سادات موجود ہیں اور دوسری طرف دیکھ لو آج بھی کہ جو ایمانی تنزل کا زمانہ ہے کسی کو یہ جرأت نہیں کہ اپنے بیٹے کا نام یزید رکھ سکے۔ جس طرح بعض زمانوں میں خدا تعالیٰ کا نام بھی دنیا سے مٹ جاتا ہے بیشک اس کے بندوں کا بھی مٹ جاتا ہے مگر جب بھی پھر خدا تعالیٰ کا نام ابھرتا ہے ساتھ ہی ان کا بھی ابھر آتا ہے۔ اگر انسان خدا تعالیٰ کے نام کو دل سے نکالتا ہے تو ان کا بھی نکل جاتا ہے مگر جب خدا تعالیٰ کا نام زندہ ہوتا ہے ان کا بھی ساتھ ہی ہو جاتا ہے۔ پس اپنی حالت کو اس رنگ میں سنوارو کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ مستقل رشتہ پیدا ہو جائے اور اس رشتہ کے پیدا کرنے کا طریق میں نے بتا دیا ہے۔ اس کے بعد مَیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بے شک لاہور کی جماعت بڑھ رہی ہے مگر لاہور کا شہراِن سے بہت زیادہ نسبت سے بڑھ رہا ہے۔ پہلے کبھی جمعہ میں مَیں نے اتنے آدمی نہیں دیکھے جتنے آج ہیں مگر پہلے شہر بھی اتنا بڑھا ہوا نہیں دیکھا جتنا آج ہے اور اگر شہر زیادہ بڑھے اور جماعت اس نسبت سے کم بڑھے تو یہ جماعت کی کمی پر دلالت کرتی ہے۔ اس لئے احباب کو تبلیغ کی طرف بھی خاص طور پر توجہ کرنی چاہئے۔ اب تو تبلیغ کے لئے ایک بہانہ بھی پیدا ہو گیا ہے۔ ہر شخص تفسیر کبیر لے کر اپنے دو دو چار چار دس دس بیس بیس بلکہ پچاس پچاس اور سَو سَو دوستوں کے پاس جائے اور اس کی خریداری کی تحریک کرے۔ یہ مَیں کسی ذاتی نفع کے لئے نہیں کہہ رہا کیونکہ یہ تفسیر سلسلہ کا مال ہے میرا ذاتی نہیں۔ نیز اس تفسیر کی اشاعت پر اس قدر زور دینے کی بھی مجھے ضرورت نہیں کیونکہ اس کا اکثر حصہ

فروخت ہو چکا ہے۔پس مَیں اس کی فروخت کے لئے نہیں بلکہ تبلیغ کے لئے ایک مؤثر ذریعہ ہونے کی وجہ سے اس کی تحریک کر رہا ہوں اور اس سے تبلیغ کے لئے موقع پیدا ہو سکتا ہے۔ بعض لوگ اسے ہتک سمجھتے ہیں کہ اسے دوسروں کے پاس فروخت کریں۔حیدر آباد کے بعض دوستوں کو مَیں نے تحریک کی تو انہوں نے کہا کہ ہم خرید کر امراء کو بطور تحفہ پیش کر دیں گے مگر مَیں نے کہا کہ مجھے یہ منظور نہیں اور مجھے پیسوں کی ضرورت نہیں بلکہ مَیں چاہتا ہوں کہ تحریک کی جائے کہ لوگ خود خریدیں۔انہوں نے کہا یہ بڑی مشکل بات ہے۔ مَیں نے کہا جب تک تم اسے بیچو گے نہیں تمہارا نفس بھی نہیں مرے گا اور اگر خود خرید کر کسی کو دے دو گے تو یہ خدا تعالیٰ کی خاطر نہیں بلکہ انسان کی خاطر نیکی ہو گی۔پس اگر لاہور کے دوست دس دس بیس بیس دوستوں کے پاس جائیں تو اسی ذریعہ سے ہزاروں لوگوں کو تبلیغ کا موقع مل جائے گا۔

کوئی گالیاں دے گا، کوئی برا بھلا کہے گا ، مگر کوئی خرید بھی لے گا اور کسی نہ کسی کے کان میں آواز پڑے گی تو کسی نہ کسی کو ہدایت بھی ہو جائے گی۔ہم نے دیکھا ہے کئی لوگوں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی کوئی کتاب خریدی تو اسی کے ذریعہ ان کے پوتے نے بیعت کر لی اور اس نے بیان کیا کہ اس طرح کتاب پڑی تھی مَیں نے اسے پڑھا تو مجھے سمجھ آ گئی اور مَیں نے مان لیا۔پس دوستوں کو تبلیغ کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیئے کیونکہ یہ مرکزی مقام ہے اور اس میں جماعت جتنی ترقی کرے گی اور جتنی مضبوط ہو گی اتنا ہی اس کا اثر سارے صوبہ پر اچھا ہو گا۔پس تبلیغ مقامی لحاظ سے بھی اور جماعت کے لحاظ سے بھی لاہور کی جماعت کے لئے بہت ضروری ہے اور اس طرف ان کو خاص توجہ کرنی چاہیئے۔" (الفضل 22 مارچ 1941ء)

1 مسند احمد بن حنبل جلد 3 صفحہ 423 مطبوعہ بیروت 1978ء، مسلم کتاب المساجد باب یَجِبُ اِتْیَان الْمَسْجد عَلٰی مَنْ سَمِعَ النِّدَاءَ

2 مہاراجہ رنجیت سنگھ پنجاب میں سکھ سلطنت کا بانی۔(اردو انسائیکلو پیڈیا)

3 بخاری کتاب الرقاق باب التَّوَاضُع

4 بخاری کتاب المناقب باب مَا لَقِیَ النَّبِیُّ ﷺ وَ اَصْحَابُہٗ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ بِمَکَّۃَ